ڈراوڑی دور میں تہذیب و ثقافت
اور
صنعت و تجارت کا تدریجی ارتقاء

(۱)

از جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہجہانپوری

ہند قدیم نے تہذیب و ثقافت، علوم و فنون اور صنعت و تجارت میں جو تدریجی ارتقا حاصل کیا اس کو متعدد ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ابتدائی اور بنیادی دور، ڈراوڑی دور کے نام سے موسوم ہے۔

مغربی مورخین کی اکثریت نے دنیا کو یہ باور کرانے میں پورا زورِ قلم صرف کر دیا کہ ایرین سے پہلے یہاں کی فضا میں جہل و بربریت کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف صحرائیت و بدویت کے آثار نمایاں تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی کی کھدائیوں نے ان کے سوچے سمجھے مقصد کی تکذیب کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ایرین سے پہلے ڈراوڑ نام کی ایک متمدن قوم یہاں آباد تھی جس کا معیاری تمدن ایرین تمدن سے بھی بعض صورتوں میں ارفع اور اعلیٰ تھا اسی بنا پر بعد کی ہمہ گیر ترقیوں کا سلسلہ انہی خطوط پر قائم ہوا جن کی بنیاد، تمدن دوست ڈراوڑوں نے ڈالی تھی، یا یوں سمجھئے کہ ان کا ذوق صنعت و تجارت اور رجحاناتِ تہذیب و ثقافت آنے والوں کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔

قدیم ڈراوڑوں یا اہل تامل کے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے دلچسپی کے جو تھوڑے بہت حالات، ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق و تلاش کے علاوہ یونانی و رومی مورخین کے اشارات و حوالہ جات

اور خصوصاً جنوبی ہند کی بعض دستیاب شدہ کتابوں سے ہم تک پہونچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دراوڑ قوم ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن کی مالک تھی، ان کے تاجر سمیریہ، بابل اور مصر وغیرہ سے تجارت کرتے تھے اور اُن کے شہر وقصبات بارونق اور خوب صورت تھے[1]، مصنفؔ "تاریخ گجرات" پروفیسر مولانا سید ابوظفر ندوی کے الفاظ میں "یہ مہذب قوم جس نے ایرین کی آمد سے بہت قبل گجرات، سوراشٹرا اور ملک کے دوسرے ساحلی مقامات کی بندرگاہوں سے اپنا تجارتی سلسلہ دور دور تک پھیلا رکھا تھا اگرچہ ہر لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم تھی لیکن ایرین کی ساجی ناانصافیوں کے دباؤ کی وجہ سے یہ خود اپنے کو ذلیل وخوار سمجھنے لگی تھی۔" ڈاکٹر لوبلر کی تحقیق کے بموجب جس وقت ہندی علاقوں کے موتی، مرجان اور گرم مسالے وغیرہ اقطاعِ عالم کے تاجروں کو ہند آنے کی دعوت دے رہے تھے اس وقت یہ قوم تہذیب وتمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہونچی ہوئی تھی، اس کے یہاں علمی، فنی اور ادبی تصانیف کا گراں بہا ذخیرہ موجود تھا اور بقول موصوف اگر آج وہ کتابیں موجود ہوتیں تو ظن وتخمین کے بجائے اُس قوم کے تمدن کا پتہ اُسی آسانی سے لگایا جاسکتا تھا جیسے رگ وید کے مطالعہ سے ایرین تمدن کا حال معلوم کیا گیا ہے، چونکہ قدیم تامل زبان معدوم ہوچکی تھی اس لئے اس زبان کی کتابوں کا معدوم ہوجانا بھی ایک فطری امر تھا لیکن آج اس تمدن کے مدفون خزانے زمین اُگل رہی ہے جن سے اُس برباد شدہ تمدن کے صحیح خدوخال نظروں کے سامنے آجانے کی پختہ امید کی جاسکتی ہے۔ ڈراوڑوں کی آبادیاں وادیٔ سندھ سے لے کر ہند کے تقریباً سب ہی حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں جو متفق علیہ طور پر ایک مخصوص تہذیب وتمدن کی مالک تھیں اُن کے تمدنی آثار اور تہذیبی نشانیاں ایرین کی آمد کے کافی عرصہ بعد تک موجود رہیں لیکن دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح ایرین نے بھی اُن کی تہذیبی عمارت منہدم کرکے ایک نئی تہذیبی عمارت کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں پیشرو کے تمام تہذیبی آثار نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ دنیا کو یقین آگیا کہ ایرین سے پہلے یہاں تمدن آشنا اور تہذیب دوست قوم آباد ہی نہ تھی

---

[1] عہد قدیم مشرق ومغرب

اس مغالطہ دہی میں مغربی ممالک خصوصاً برطانوی دور کی درسیہ تاریخوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک پوری دنیا مذکورہ مغالطہ پر قائم رہی حتیٰ کہ یہ مغالطہ ایک حقیقت ثابت ہو گیا۔ خدا بھلا کرے ماہرین آثار قدیمہ کا جنھوں نے کھدائیوں کے نتائج سے اس طلسم باطل کا پردہ چاک کر کے حقیقت کی رونمائی کی لیکن برطانوی دور کی تاریخوں کا پھیلایا ہوا زہر ذہن وشعور کو اتنا ماؤف کر چکا تھا کہ ابتدائً ان انکشافات ونتائج سے بھی صرف نظر کیا گیا مگر کھدائیوں کا تسلسل اور ان سے برآمد ہونے والے تہذیبی آثار، ان زہریلے اثرات کو زائل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور آخر میں ان منکرین کو بھی اصل حقیقت واصلیت کا اقرار واعتراف کرنا پڑا۔

اس قدیم تہذیب کی دریافت کا اولیں سہرا سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ اور ان کے متعدد ملکی اور غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ کی اَن تھک کوششوں کے سر ہے جن میں سر الگزنڈر کنگھم، ایچ ایس والس، کے این ڈکشٹ، دیارام ساہنی اور مزمدار کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ڈراوڑی تہذیب وتمدن کی بیش بہا دولت ہنوز زیر زمین مدفون ہے، کھدائیوں کی تکمیل اور مدفون آثار برآمد ہونے کے بعد ہی کوئی جچا تلا فیصلہ منظر عام پر آسکتا ہے، بہرحال کھدائیاں مکمل ہوں یا نامکمل لیکن اس حقیقت سے سرمو انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ آریین کی آمد سے صدیوں پہلے فضائے ہند پر ڈراوڑی تہذیب وتمدن کا مہر منیر پوری تابناکی سے روشن ہو چکا تھا بلکہ اس نے ایک نوع کی ارتقائی صورت بھی اختیار کر لی تھی۔

ہند کے یہ قدیم ترین باشندے یعنی دراوڑ کون تھے، کہاں سے آئے، کب آئے، کس نسل وقبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ ان سوالوں کے جواب ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں، صرف اتنا وثوق سے سے کہا جا سکتا ہے کہ آریین سے ان کا کوئی سابقہ قبائلی رشتہ اور تعلق نہ تھا، ان کی قدیم تاریخ کا صحت مندانہ حال معلوم کرنا اسی قدر مشکل ہے جس قدر خود ہند کی تاریخ کا پتہ چلانا۔ لیکن انسان کی تلاش وجستجو، فکر وطلب اور چھان بین کا تسلسل بہت سے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی کر چکا ہے بنابریں اس میں بھی اس نے بہت کچھ ایسی معلومات حاصل کر لیں جو ظن وتخمین

کے تنگ دائرہ سے نکل کر یقین راذعان کی وسیع حدود میں آچکی ہیں بقول مصنف تاریخ گجرات مولانا سید ابوظفر ندوی پتھر اور لوہے کے زمانہ کے بعد اس ملک کی غالب اکثریت ڈراویڈ کی تھی۔ مصنف مذکور نے غالب اکثریت کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ موصوف کے نزدیک ڈراوڑ کے علاوہ اس ملک کے صحرائی اور پہاڑی خطوں میں اور بھی متعدد قومیں اقلیتی صورت میں موجود تھیں جن میں بھیل، گونڈ، اور سنتھال نام کی اقلیتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی جو ڈراوڑوں کے مقابلہ میں ہر نہج سے پس ماندہ، تہذیب وتمدن سے ناآشنا، علوم وفنون سے بے بہرہ تھیں لیکن اکثر مورخین کے نزدیک یہ سب قبائلی سلسلے ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھے یعنی نسلاً یہ سب ڈراوڑ ہی تھے لیکن اپنی معاشرتی پس ماندگی کی بنا پر دسوں طبقوں میں منقسم ہوگئے تھے، چونکہ یہ زیادہ تر دشت وجبل میں بود وباش رکھتے تھے، زیور تعلیم سے عاری اور عقل وشعور میں کم مایہ اور خستہ حالی میں اپنی نظیر آپ تھے اس لئے ساحلی اور شاداب میدانی خطوں میں رہنے والے باشعور ڈراوڑوں نے خود ہی اپنے نسل وقبیلہ کے لاکھوں افراد کو ازراہ تحقیر مذکورہ ناموں سے پکارنا شروع کر دیا تھا اور بعض کے خیال میں ان کی بدویت اور پس ماندگی کی بنا پر زمانۂ مابعد میں یہ نام رکھے گئے، مذکورہ برتری اور پس ماندگی کے فرق کو آج کے آئینہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، اول الذکر زیور تعلیم سے آراستگی کے باعث بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور موخرالذکر ہنوز پس ماندگی اور جہالت وغربت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس صحرائیت اور جہالت کی منہ بولتی تصویر مدھیہ پردیش اور ہماچل کے پہاڑی دامن میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈراوڑوں کی صحیح تاریخ کا علم تو دور کی بات رہی، یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اُس عہد میں یہ حسن بداماں ملک کس نام سے موسوم تھا، تاریخ کی زبان بھی اس سلسلے میں ساکت وخاموش ہے اور نہ کھدائیوں نے اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی کی ہاں کچھ صوبہ جاتی اور علاقائی ناموں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایرین ڈراوڑوں کی بود وباش کی جگہوں کو ازراہ تمسخر "ارنی" کہتے تھے جس کے معنی جنگل اور صحرا کے ہیں چونکہ یہ ایرین کے فاتحانہ دباؤ کی وجہ سے میدانی اور مرغزاری علاقوں کو چھوڑ کر غیر آباد کوہستانی علاقوں

میں جا بسے تھے اس لیے ایرین نے معنویت کے لحاظ سے ان کے علاقوں کا یہ نام رکھ چھوڑا تھا[1] چنانچہ آج بھی بعض ریاستوں کے سررشتۂ مال کے کچھ کاغذات سے اس کی تصدیق ہوتی یعنی صحرائی اور غیر زرخیز زمینوں کو "ادنی محال" کہا جاتا ہے۔ ایرین کی اس علاقائی تقسیم سے اس ملک کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایرین نے اپنے مفتوحہ علاقہ کا کیا نام دے رکھا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں جو سیر حاصل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"عربوں کی آمد سے قبل اس پورے ملک کا کوئی نام نہ تھا بلکہ ہر صوبہ کا نام الگ تھا اور بیرون ملک ہر ریاست کا نام اس کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا، اہل فارس نے جب سندھ پر قبضہ کیا تو دریائے سندھ کی موجودگی کی وجہ سے اس صوبہ کا نام سندھو رکھا۔ موصوف کے نزدیک سندھو کے بجائے ہندھو نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قدیم فارسی اور سنسکرت میں حرف س اور ہ کو آپس میں بدل لیتے ہیں اس لئے انھوں نے اس کو ہندھو کہہ کر پکارا، لیکن عربوں نے دریائے سندھ کی مناسبت سے اس صوبہ کو سندھ ہی کہا اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ہند قرار دیا اور آخر میں یہی نام پورے ملک کیلئے تمام دنیا میں مختلف صورتوں سے پھیل گیا اور ہ کا حرف الف ہوکر فرنچ میں انڈا، اور اس کی مختلف صورتیں ہوکر تمام دنیا میں مشہور ہوگیا اور خیبر سے آنے والی قوموں نے ہندواستھان نام سے اس کو پکارا جو فارسی تلفظ میں ہندوستان ہوگیا[2]"

تیج بہادر سنہا ایڈیٹر روہیلکھنڈ اخبار نے بھی جو کچھ سپرد قلم کیا ہے اس سے بھی مذکورہ سطور کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ ایڈیٹر موصوف لکھتے ہیں کہ

"اس ملک کو یہ نام عربوں ہی کا دیا ہوا ہے اگر وہ اس ملک میں نہ آئے ہوتے تو یہ ملک

---

[1] تاریخ گجرات از مولانا ابوظفر ندوی

[2] عرب و ہند کے تعلقات

ہندوستان کے بجائے جنوبی ایشیا یا ایسے ہی کسی نام سے پکارا جاتا اور اس میں بے شمار خود مختار اور آزاد ریاستیں ہوتیں۔"

تاریخی حیثیت کے ساتھ ڈراوڑوں کی اصلیت اور وطنیت کے بارے میں بھی علمائے تحقیق متفق الرائے نہیں، کچھ محققین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں پائے جانے والے دروں سے یہاں آئے اور بعد کو جنوبی ہند پہونچے اس خیال و فکر کے سب سے بڑے موئید ڈاکٹر ہنٹر ہیں بعض کے نزدیک یہ ہندوستان ہی کے اصل اور قدیم ترین باشندے ہیں اور جنوبی ہندان کا اصل اور بنیادی وطن ہے اور یہیں سے سندھ ویلی، بلوچستان اور شمالی ہند میں پھیلے، دلیل یہ ہے کہ ڈراوڑ یا ڈراوڈ جنوبی ہند کے تامل علاقہ کا قدیم نام ہے جہاں کے رہنے والے تامل تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانیں بولتے ہیں۔ ایک اور نظریہ کے مطابق ان کی اصل آبادیاں خصوصی طور پر وادی سندھ، پنجاب اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ایک مخصوص تہذیب کی مالک تھیں لیکن ایرین فتوحات کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے تحفظ کی خاطر مذکورہ علاقوں سے نقل مکانی کرکے جنوبی ہند کے تمام علاقہ کو اپنا مسکن بنالیا اور اس جگہ چیرا، چولا اور پانڈیہ نام کی تین طاقتور حکومتیں بھی قائم کرلیں، یہ تجارتی میدان میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ روم، مصر اور مشرق وسطیٰ کے علاقوں سے ان کا تجارتی رابطہ بھی قائم ہوگیا تھا اور اس رابطہ کو مستحکم بنانے کے لئے انھوں نے ایک مضبوط تجارتی بیڑہ بھی تیار کرلیا تھا۔ اشوک کے زمانہ تک ان حکومتوں کا وجود ملتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ نہ جنوبی ہند سے سندھ ویلی اور بلوچستان وغیرہ پہونچے اور نہ شمال مغربی دروں سے ہند میں داخل ہوئے بلکہ یہ ایک ہی قوم و نسل تھی جو ہند کے دوسرے میدانی، کوہستانی اور ساحلی مقامات کی طرح سندھ ویلی، بلوچستان، پنجاب اور کاٹھیاواڑ میں قدیم سے آباد تھی، چونکہ ہر حصہ کے باشندوں کے مذہبی تصورات اور طرز معاشرت وغیرہ میں یکسانیت اور ہم آہنگی کارفرما تھی اس لئے مجموعی طور پر اس قوم کا نام ڈراوڑ رکھدیا گیا اس نظریہ اور خیال کے بہت سے علمائے تحقیق موئید نظر آتے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی حالیہ علاقائی

کھدائیوں سے مختلف قسم کے انسانی ڈھانچوں کی دستیابی نے علمائے تحقیق کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دی ہے اس سلسلہ میں انھوں نے جو اندازے قائم کئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف جنوبی ہند کے بسنے والے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے ڈراوڑ، رومی اور آسٹریلین نسلوں کا مرکب ہیں کیونکہ دستیاب شدہ ڈھانچے علامات کے اعتبار سے بحر روم کے علاقائی خطوں کے باشندوں سے ملتے جلتے ہیں اور بعض آسٹریلین نسل کے باشندوں کی علامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کچھ اہل فکر و نظر نے اس سے ملتا جلتا مگر زیادہ صاف اور واضح نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بحر روم کے علاقوں سے تعلق رکھنے والی نسل نے آسٹریلوی نسل پر حاکمانہ قبضہ و اقتدار حاصل کر لیا بعد کو یہ نسل جو اپنے ساتھ ایک تہذیب بھی لائی تھی پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور آخر میں ان دونوں نسلوں کے باہمی اختلاط سے جو نسل عالم وجود میں آئی وہ ڈراوڑ نسل کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی[1]، اس نظریہ کے ساتھ دستیاب شدہ ڈھانچوں سے بعض مفکرین کا یہ فیصلہ بھی نظر کے سامنے آجاتا ہے کہ ہڑپا، موہنجوڈارو، ڈراڈا اور جھٹ پٹ کے وسیع علاقوں کے رہنے والے آسٹریلین نسل سے اور وادیٔ سندھ کے باشندے بحر رومی علاقوں کے باشندوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان تمام ظنی تفصیلات اور تخمینی کاوشوں کے مقابلہ میں اکثریت کا یہ فیصلہ زیادہ صحت مندانہ اور قرین عقل ہے کہ ڈراوڑ ہند کے اصل باشندے ہیں اور جنوبی ہند کا علاقہ ان کا بنیادی وطن ہے اور یہیں سے ہند کے تمام علاقوں میں پھیل کر انھوں نے تہذیب و تمدن اور صنعت و تجارت کے تمام ارتقائی منازل طے کئے اور ڈاکٹر ہنٹر کا یہ نظریہ کہ ڈراوڑ تورانی النسل ہیں اور آرین سے ہزاروں سال پہلے وہ شمالی مغربی دروں سے ہند میں داخل ہوئے قطعاً غلط تصورات پر مبنی ہے اور اسی کے ساتھ اس نظریہ کا بھی بطلان ہو جاتا ہے کہ قدیم آسٹریلین اور بحر رومی علاقوں کی سندھ دیلی میں آباد نسل کے باہمی اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی۔

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

ڈراوڑی تہذیب وتمدن کی قدامت اور تقابل

تہذیب وتمدن کی خشت اول اسی وقت رکھی گئی تھی جب انسان نے اس عالم رنگ وبو میں قدم رکھا اور زندگی گزارنے کے مختلف اقدامات کئے جوں جوں انسانی شعور آگے بڑھتا گیا تہذیبی پودے کی نشوونما میں تیزی آتی گئی۔

جدید تجرباتی دور کی تدریجی ترقی میں ہر ملک نے یکساں پیش رفت نہیں کی، کوئی ملک ذہنی شعور میں آگے بڑھ گیا اور کوئی پس ماندہ رہ گیا۔ مصر وبابل، چین وایران اور یونان وروم میں سے ہر ایک اولیت کا مدعی ہے لیکن اہل ہند کا اصرار ہے کہ عقل وشعور کی دنیا میں ان کے قدم سب سے آگے ہیں یعنی تہذیب وتمدن کا مہر منور سب سے پہلے مطلع ہند پر نمودار ہوا۔ تہذیب کشمکش حیات میں ایک مستقل جدوجہد کا نام بھی ہے جس طرح زندگی بڑھاپے سے نبرد آزمائی کے لئے اپنے میں خاص توانائی وتازگی بہم پہونچانے کی کوشش کرتی ہے اسی طرح تہذیب کو بھی اپنے بقاواستحکام کے لئے نئے خون اور نئے مکان کی ضرورت پیش آتی ہے اگر وہ ایک جگہ سے مٹتی ہے تو دوسری جگہ ابھرتی ہے، اگر حوادث ایک جگہ سے اس کو ظلمت وتاریکی کے گھرے بادلوں میں چھپادیتے ہیں تو دوسری جگہ وہ اپنا حسین ودلکش چہرہ بے نقاب کردیتی ہے، غرض اس کے ابھرنے اور مٹنے کا چکر دنیا کی گردش کے ساتھ قائم رہا ہے، یہ آغوش محبت میں پرورش پاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے، دشمنی اور عناد کی گود میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اس کا نظر نواز چہرہ جب گردِ کدورت سے متغیر ہوجاتا ہے تو یہ خوش آمدید کہنے والی آغوش کی زینت بن جاتی ہے، جب اہل مصر کی نا اہلیت اس کی طبع نازک پر گراں گزری تو یہ اہل بابل کی زینت آغوش بنی، جب یہاں قدر ناشناسی کا اظہار ہوا تو یہ کبیدہ خاطر ہوکر آشوریوں کی محبت بھری آغوش میں جابیٹھی، انھوں نے جب تک اس کی نازبرداری کی تو اس نے ارض آشوریہ کو اپنی سدابہار رنگینیوں سے کفِ گل فروش اور دامنِ باغباں بنادیا۔ اس طرح یہ دنیا کے ہر ملک میں پہونچی اور قدردانی کے وقت تک موجود رہی اور ناقدری کا شکار ہوتے دیکھ کر اس نے اپنا روشن اور مسکراتا ہوا چہرہ چھپالیا۔ غرض یہ عروسِ ہزار عشوہ بڑی تنک مزاج واقع ہوئی ہے، اس کی تنک مزاجی کے

نازو غمزے جس نے خندہ پیشانی سے اٹھا لئے اس سے وفاداری کا تعلق اس نے کبھی نہ توڑا اور جس جانب سے ناقدری کا ذرا سا بھی اشارہ پایا اس طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ڈراوڑوں نے اس سے جو رشتۂ الفت جوڑا تھا اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ استحکام بھی پیدا ہوتا گیا۔ ایرین نے اس تنک مزاج ہزار عشوہ کو محبوبیت کے سارے انداز بخشے جس سے اس کے رخِ زیبا میں ہوئے انداز دل ربائی پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ یہ اسی قدر شناسی اور محبت کا نتیجہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے اثراتِ بد سے تہذیب ہندی کی عمارت نہ صرف محفوظ و مصئون رہی بلکہ ہر دور میں اس عمارت کے نقش و نگار اور آراستگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

دراوڑی تہذیب و تمدن کے آغاز کا زمانہ آثار تہذیبی کے مبصرین نے تین ہزار سے پانچ ہزار قبل مسیح تک لگایا ہے، چونکہ دراوڑوں نے جدید حجری دور کے ختم ہی سے اس طرف عنانِ توجہ منعطف کر دی تھی اس لئے ہند میں تہذیب و تمدن کا آغاز چھ ہزار قبل مسیح متعین کیا گیا ہے غالباً انہی شواہد کی بنا پر پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم نے ۱۹۶۰ء کے ایک شائع شدہ مضمون میں ہندی تہذیب کا بنیادی دور چھ ہزار قبل مسیح قرار دیا ہے، پروفیسر موصوف کی اس رائے کو دیگر اہل الرائے نے بھی جس میں سابق صدر جمہوریہ راجندر پرشاد آنجہانی بھی شامل ہیں حقیقت سے تعبیر کیا ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ جس وقت مصر کے شہنشاہ زوسر نے سب سے پہلے اہرام اور شہنشاہ خوفو نے غزہ میں بڑے اہرام کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت یہاں تہذیبی پیش روی نقطۂ عروج پر تھی اور صنعتی و تجارتی ترقی شباب پر تھی[1]۔

علمی اور ثقافتی پیش رفت

ثقافت بنیادی طور پر ایک ذہنی صفت ہے اور اسی کے ساتھ معاشرت و تہذیب سے بشری فکر کا جو ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اسے بھی ثقافت کا نام دیا جا سکتا ہے، تہذیب و معاشرت کا مرکز مادی اشیا سے اور ثقافت کا مرکز ذہن و دماغ کی

---

[1] عہدِ قدیم شرق و مغرب

فکری قوتوں سے ہے اور ان فکری قوتوں کے بطون سے شاعری، مصوری، نقاشی، ادب وتنقید، تلاش وتحقیق، سائنس وفلسفہ اور موسیقی وغیرہ وجود میں آتے ہیں۔ ثقافت قوم کی تہذیبی اور نظریاتی بنیادوں کی مکمل عکاس ہوتی ہے حقیقت میں ثقافت ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں قوم کی اخلاقی کیفیت کا صحیح عکس نمایاں ہوتا ہے ثقافت کی تنظیم اگرچہ خود ریاست کی مقررہ حکمت عملی کے تحت ہوتی ہے لیکن اخلاقی اقدار کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اخلاقی اقدار کا فقدان کسی نظام حیات کو برباد کر سکتا ہے تو ثقافت کو بھی تباہی میں ڈال سکتا ہے کیونکہ قوم کے اخلاقی بگاڑ سے سب سے پہلے اس کی ثقافتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

ڈراوڑوں کی ثقافتی اور علمی پیش رفت کا پتہ کھدائیوں کے نتائج، ظن وتخمین، زمانہ مابعد کے نوشتہ جات، قدیم یونانی ورومی اور عرب محققین کی تحقیق وتلاش کے علاوہ ڈراوڑوں کی قدیم ترین علمی تصانیف کی دستیابی سے بھی لگایا گیا ہے۔ بدیہی قرائن سے رسم الخط کی موجودگی کے ساتھ ان کی عام تحریری واقفیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ قرائن ان مہروں کی دستیابی سے یقین و اذعان سے بدل جاتے ہیں جو ڈراوڑ برآمد ہونے والے کپڑوں پر اپنے ناموں کے بجائے لگایا کرتے تھے لیکن رسم الخط کی نوعیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا[1]۔ اس وقت کے ترقی یافتہ تہذیبی ملکوں میں دو قسم کے رسم الخط جاری تھے، تصاویری اور علامتی، اس لئے قیاس کہتا ہے کہ انہی دو میں سے کوئی ایک ہوگا، حروف تہجی پر مبنی رسم الخط کے بانی یا موجد فینقی عرب کہے جاتے ہیں جو فلسطین اور شام ولبنان کے سواحل پر آباد تھے اور اپنی بحری تجارت کے اعتبار سے ایک طرف وہ افریشیائی علاقوں پر اثر انداز ہوتے تھے اور دوسری طرف ان کا تہذیبی رنگ یونان تک پھیلا ہوا تھا، بدیں وجہ اہل قیاس کے نزدیک ڈراوڑی رسم الخط بھی ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ ان کے حروف تہجی کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے حروف

---

[1] عہد قدیم شرق ومغرب

تہجی کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی اس لئے آر ڈی بنرجی اور سرجان مارشل کے متفقہ قیاس کے بموجب بابلیوں کے حروف تہجی کی طرح ڈراوڑی حروف تہجی کی تعداد بھی ڈھائی سو سے کم نہ تھی بابلیوں کا خط میخی بھی اسی تعداد کے ساتھ حمورابی کے زمانہ تک جاری رہا۔ اس سے ان دونوں ماہرینِ آثار قدیمہ نے یہ رائے قائم کی ہے جو بڑی حد تک قرین عقل ہے۔ وادئ سندھ، گجرات، جنوبی ہند اور بنگال کی حالیہ کھدائیوں سے جو مہریں دستیاب ہوئی ہیں ان سے علامتی اور ابجدی دونوں رسم الخطوں کی نشاندہی ہوتی ہے اس سے بعض اہل قیاس نے اندازہ لگایا ہے کہ ابتدا میں علامتی رسم الخط مروج ہوگا اور بعد کو ابجدی سلسلہ شروع ہوا۔ فادر ایچ ایس ہیرآس نے مختلف حصوں سے دستیاب شدہ مہروں کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ ڈراوڑی رسم الخط ابتدا ہی سے حروف تہجی پر مبنی تھا اور ان کی زبان موجودہ تامل زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ ڈاکٹر بوہلر نے بڑی تحقیق کے بعد جو مبصرانہ رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"آرین کی آمد سے تین سو سال قبل تک ڈراوڑوں کی اصل زبان پھوٹ کر تامل، تلیگو، کنڑا اور ملیالم وغیرہ میں منقسم نہیں ہوئی تھی بلکہ سارے جنوبی ہند میں اس وقت صرف ایک ڈراوڑی زبان بولی جاتی تھی جسے ہم سہولت کی خاطر تامل کہہ سکتے ہیں۔"

بعض مبصرین کے نزدیک ڈراوڑوں کی اصل زبانیں جغرافیائی حد بندیوں کے فرق کے ساتھ یہی تھیں جو آج ترقی یافتہ شکل میں جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں لیکن مبصرین کی اکثریت ڈاکٹر بوہلر کے ہم خیال و ہم رائے ہے۔ چنانچہ فادر ایچ۔ ایس ہیراس نے ہڑپا کی مہروں کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہڑپا کے وسیع علاقہ اور سندھ ویلی کی عام زبان صرف تامل تھی، ساتھ ہی موصوف کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ سنسکرت میں ڈراوڑی زبان کے متعدد حروف کی آوازیں شامل ہیں چنانچہ زمانہ مابعد کے علمائے تحقیق نے ٹ، ڈ اور ڑ کی آوازوں کو متعین و مشخص بھی کر دیا ہے کہ یہ اصلاً ڈراویڑی آوازیں ہیں۔ اس تمام تحقیق و تلاش کے نتیجہ میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ فینقیوں کی مسلسل آمد و شد سے بہت پہلے ڈراوڑ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہو چکے تھے اگرچہ تمام دستیاب شدہ اشیاء میں کسی

تصنیف کے دستیاب ہونے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن مختلف علمائے تحقیق کی جو کاوشیں نظروں کے سامنے آئی ہیں ان کو ترتیب دینے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ فطرت کی صحیح بخشی کی بنا پر تصنیف کا آغاز اسی سرزمین علم وحکمت میں ہوا یعنی دنیا کی پہلی کتاب ارض ہند میں عالم تصنیف میں آئی چنانچہ مولانا غلام آزاد بلگرامی نے مشہور تصنیف "غزلان ہند" میں شیخ علی رومی کی تصنیف "محاضر الاوائل ومسائر الاواخر" سے یہ فقرہ نقل کیا ہے[1]:

"اول موضع وضعت فیہ الکتب وانفجرت منہ ینابیع الحکمۃ

کان الھند۔"

یعنی سب سے پہلے جس سرزمین پر کتاب لکھی گئی اور جہاں سے علم وحکمت کا چشمہ پھوٹا وہ ہندستان ہے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں علمی اور ایجادی اولیت کے بیان میں تصنیفی اولیت کا سہرا اہل ہند کے سر باندھا ہے۔ تاریخی اوراق میں حضرت علی سے بھی منسوب ایک ایسا فقرہ ملتا ہے جس میں ہند کو اولیں تصنیف کا گھر کہا گیا ہے۔ عرب کے مشہور متکلم اور مشہور فلاسفر ابن جاحظ نے اپنے مرتبہ رسالہ "ساکنانِ عالم کے ذہن ودماغ کی کیفیات" میں دلائل عقلیہ کی روشنی میں ذہن ہندی کی ایجادی اور تخلیقی قوتوں کو مرجح ثابت کیا ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں پہلی تصنیف کا دعوی ایرین نہیں کر سکتے کیونکہ ایرین اپنے دسطی دور کے بعد ہی فن تحریر سے واقف ہو کر اپنے کاروباری کھاتے لکھنے کے قابل ہو سکے تھے[2]۔ ایرین اور یونانی تہذیب کا نقطۂ آغاز وعروج ایک ہی ہے اور ان دونوں تہذیبوں سے پہلے دجلہ وفرات کی شاداب وادی میں بابل نام کی ایک تمدن آشنا حکومت قائم تھی جس کے ایک مشہور حکمراں حمورابی کا دوسو بچاسی دفعات پر مشتمل ایک دستوری اور قانونی مسودہ تصنیفی سلسلہ کی موجودگی

---

[1] بحوالہ مقالات شبلی

[2] عہد قدیم شرق ومغرب

ظاہر کرتا ہے اور اس سے بھی قبل پادری مان تھیو "MANTHEW" کی تصنیفات اور قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان سے سرزمین فراعنہ میں متعدد علوم وفنون پر تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ ان تمام شواہد سے اہل فکر نے اندازہ لگایا ہے کہ ایرین دور سے بہت پہلے دنیا کے مختلف متمدن ممالک میں تصنیفی سلسلہ کا آغاز ہو چکا تھا اس کے باوصف ان تمدن آشنا ممالک کی کسی تصنیف کو اہل تحقیق نے دنیا کی اولین تصنیف میں شمار نہیں کیا اس سے بدیہی طور پر یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کی پہلی کتاب ڈراوڑی عہد میں تصنیف ہوئی لیکن اس کے موضوع فکر کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈراوڑوں کے علمی ذوق کا صحیح اندازہ جنوبی ہند کی مختلف ریاستوں کی علمی پیش رفت اور فنی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایرین کے فاتحانہ دباؤ کی وجہ سے ڈراوڑ جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں جمع ہو گئے تھے جہاں انھوں نے ایک زبردست شہنشاہیت کے بجائے متعدد حکومتیں قائم کر لی تھیں جن میں چولا، چیرا، پانڈیا، کرالا، کرناٹک اور کنٹالاریار زیادہ مشہور ہیں۔ اگرچہ ایرین کی حکمت عملی کی بنا پر یہ باہم دست و گریباں رہ کر اپنی تمام قوتیں برباد کرتی رہیں لیکن اس انتشار کے باوصف ان میں سے ہر ایک نے علوم وفنون کی پیش روی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیا۔ پانڈیہ ریاست کا دارالحکومت علم و ہنر کا مرکز تھا یہاں مختلف ادوار میں زبان و ادب اور دیگر علوم وفنون کی پیش روی کیلئے علماء و مصنفین کے تین علمی مرکز قائم تھے خصوصاً مدورا کے علمی مرکز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اس عظیم الشان علمی ادارہ کو شاہی سرپرستی حاصل تھی اور اس کی سفارش پر مصنفین کو شاہی خزانہ سے انعام واکرام سے نوازا بھی جاتا تھا۔ شعر وسخن کے سلسلہ میں بھی ڈراوڑوں کا پایہ بہت بلند کہا گیا ہے اور اس میں زبان و ادب کی پوری چاشنی اور اندازِ بیان کی پوری کشش بیان کی گئی ہے۔ تامل زبان کی عروضی بحور سنسکرت بحور سے بالکل مختلف تھے ان کی اثریت کے مقابلہ میں سنسکرت کے عروضی بحور کو بے اثر کہا گیا ہے۔ چنانچہ اہاول وینا، کلیپا اور ونجیپا نام کی بحور کو تامل زبان کی ایسی نشانیاں کہا جاتا ہے جن کی مثال سنسکرت زبان میں نہیں ملتی۔

رزمیہ نظموں کے لحاظ سے بھی قدیم تامل ادبیات کو مالامال کہا گیا ہے چنانچہ پانچ رزمیہ نظموں

کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی تھی جن میں سلپا تھیکارم اور منی میکلائی کو اثریت اور تخاطب کے لحاظ سے رامائن اور مہابھارت کے ہم پلّہ بتایا گیا ہے۔ اول الذکر میں مختلف ذاتوں اور پیشہ وروں کی ایک صحیح تصویر الفاظ کے ذریعہ کھینچی گئی تھی۔ اس تصویر کشی کے علاوہ اس خصوصیت نے اس کو قدیم ہندوستانی ادبیات میں ایک گونہ ممتاز بنا دیا تھا کہ یہ حزنیہ جذبات وعناصر سے معمور تھی، اس کے ہر فقرہ کو درد و اضطراب کی منہ بولتی تصویر کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے یونانی ٹریجیڈی کی اثریت کی طرح دل و دماغ پر ایک کرب آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رزمیہ نظموں کے پہلو بہ پہلو بزمیہ نظموں کی بھی قدیم تامل زبان میں کوئی کمی نہیں بتائی جاتی اس سلسلہ میں بہت سی کتابوں کے نام لئے جاتے ہیں جن میں پورا نالورو، کلیتھوکائی اور پاتھوپتو وغیرہ نامی تصانیف کو بزمیہ شاعری کی جان کہا گیا ہے۔ نظمیہ تاریخی تخلیقات کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں قدیم ترین تامل فرماں رواؤں کے کارناموں کے ساتھ ملکی تہذیب و معاشرت، رسوم و رواج کی بھی مکمل عکاسی بتائی گئی ہے، ان میں دو کتابوں نالا بار اور کورلر کا ذکر قدیم تذکروں میں پایا جاتا ہے، نالا بار کو ایسی بے نظیر ذہنی تخلیق بتایا گیا ہے کہ سنسکرت زبان کے مفکر شعرا بھی اس کے طائر تخیل کی پرواز اور جذباتِ لطیفہ کی گہرائی تک نہ پہونچ سکے، اسی بنا پر تامل زبان کی قدیم شعری ادبیات میں اس کو چوٹی کی تخلیق کا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہ نظم تین حصوں پر مشتمل بتائی جاتی ہے۔ حصہ اول نیکی، دوسرا دولت، تیسرا سچی مسرت۔ قدیم مبصرین کے نزدیک الفاظ کی شیرینی، طرز ادا کی دل آویزی، فکر و تخیل کی رفعت اور جذبات کی لطافت نے مل کر شاعر کے کلام میں تأثر کی ایک ایسی روح پھونکدی تھی کہ قاری و سامع کے دل و دماغ پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک یہ خوبی بھی اس تخلیق کی بتائی جاتی ہے کہ شاعر کا مستانہ تخاطب قوم و فرقہ اور رنگ و نسل سے ہٹ کر تمام نوع بشری کے لیے تھا۔

علم ہیئت و نجوم اور جوتش کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے بانی اور موجد ارین ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ارین اثر قبول کرنے سے پیشتر ہی ڈراوڑوں نے عملی ہیئت مرتب

کرلی تھی، ڈاکٹر میک لین کے خیال کے مطابق جنوبی ہند کے دراوڑ ماہی گیروں نے چاند کے بڑھنے گھٹنے کا مشاہدہ کر کے وقت کی تقسیم کا قمری حساب مرتب کر لیا تھا اور میدانی علاقوں کے مغاربین نے آفتاب کی حرکت سے مختلف فصلوں اور موسموں کا تعین بھی کر لیا تھا اسی کے ساتھ ڈاکٹر سلیٹر کا یہ بیان بھی شامل کر لیا جائے تو حقیقت کی تصویر اور بھی صاف نظر آنے لگتی یعنی تاملوں کی تقسیم بالکل شمسی تھی، ان کے مہینہ کے دن مقرر نہ تھے انھوں نے فلک کے بارہ حصے قائم کئے تھے جس وقت بھی آفتاب ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں داخل ہوتا تھا اسی وقت سے دوسرا مہینہ شروع ہو جاتا تھا۔ غرض مختلف علمائے ہیئت نے تامل تقویم کو مروجہ تقاویم سے زیادہ صحیح اور درست مانا ہے[1]۔ فن موسیقی اور راگ راگنیوں کی ایجاد میں بھی ڈراوڑوں کو خاص درجہ دیا گیا ہے اگرچہ اس فن پر دسوں تصانیف حوادث روزگار کی نذر ہو چکی ہیں پھر بھی ان کے کچھ دھندلے سے نقوش سلپاتھیکارم میں محفوظ بتائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کا وہ حصہ بہت ہی مقبول کہا جاتا ہے جس میں "ایلنگو اڈیکل" جیسے مشہور شاعر اور ماہر موسیقی نے مختلف سُروں، دُھنوں یا راگ راگنیوں کی تشریح و توضیح کی ہے۔

مذہبی تصورات

چونکہ ڈراوڑی تہذیب کا ارتقا تدریجاً اور منزل بہ منزل عمل میں آیا اس لئے ان کے مذہبی معتقدات میں اوہام پرستی سے لے کر شائستہ تصورات کے تمام ارتقائی شواہد پائے جاتے ہیں، تمدن کے ابتدائی مراحل میں شجر و حجر، مہر و ماہ، بھوت پریت اور مختلف حیوانات کی پوجا پاٹ مذہبی تصورات کے جزو تھے لیکن ذہن و شعور کے ارتقا کے ساتھ مذہبی تصورات میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں اور ان کے مذہبی دیو مالا میں ایسے پرشوکت دیوتا شامل ہو گئے کہ ایرین بھی نوامیس فطرت کے پرستار ہونے کے باعث ان کے دیو مالا میں شریک ہو گئے۔

ڈراوڑوں کے خاص دیوتا رودرا، اور کوروائی نام کے ہیں۔ سیو دیوتا بھی جزیرہ نما ہند

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب

تکے ڈراوڑوں کا بھی ایک قدیم الایام دیوتا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کے نزدیک بھی یہ ڈراوڑوں کا ایک علاقی ودسن یعنی پہاڑی دیوتا تھا۔ ایرین کی بعض قدیم کتابوں میں سید کو دکشنا مورتی کا نام دیا گیا ہے۔ لنگ پوجا بھی ڈراوڑوں کی خاص پوجا تھی، حالیہ کھدائیوں سے بہت سے غیر تراشیدہ پتھر کے لنگم برآمد ہوئے ہیں جن سے قدیم ڈراوڑوں میں لنگ پوجا کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ جنوبی ہند کی حالیہ کھدائیوں سے بھی کچھ مخروطی شکل کے چکنے پتھر دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس پوجا کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لنکا کا راجہ راون سیو لنگ کی پوجا بڑے اہتمام سے کرتا تھا حتیٰ کہ یہ ڈراوڑ راجہ سونے کا ایک لنگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تاریخی اشاروں کی بنیاد پر سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل نے اس پوجا کو ڈراوڑوں کی قدیم ترین پوجا میں شمار کیا ہے۔ تناسخ یا آواگون کا عقیدہ بھی ڈراوڑوں کا خاص عقیدہ تھا۔ تلا سوامی پلے کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ڈراوڑ تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ دوسرے مفکرین کی نظر میں تناسخ ہند کا قدیم ترین تخیل ضرور ہے لیکن ایرین بھی اس تخیل کو اپنے ساتھ لائے تھے اس لئے یہاں کی متعدد سوسائٹی اور سماج کے اثر نے اس تخیل کو ایک عقیدہ کی شکل دے دی۔

اوتار کا عقیدہ ڈراوڑوں میں اکابر پرستی کا طریقہ قدیم الایام سے مروج تھا وہ اپنے بزرگوں کی روحوں کو نذر و نیاز سے خوش کرتے تھے اور ان کی شاندار یادگاریں قائم کرکے ان کے روشن کارناموں کو ہر قیمت پر زندہ رکھتے تھے۔ ان قومی ہیروں کے یادگاری سلسلوں سے تجسیم الوہیت یعنی اوتار کے عقیدہ کا آغاز ہوا۔

کثرت میں وحدت کا تخیل اگرچہ اکابر پرستی کے نتیجہ میں ڈراوڑوں میں تکثیر الوہیت شباب پر تھی۔ بظاہر ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں بھی خدائے واحد کا ہلکا سا تصور بھی نہ تھا لیکن عوامی ذہن سے ہٹ کر ایک ایسا باشعور طبقہ بھی ان میں نظر آتا ہے جس کو تکثیر الوہیت میں ذات واحد کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے اور ان سب پر ذات کن فکاں کا ہاتھ غالب اور بالا معلوم ہوتا ہے اس شعوری طبقہ کے تصور میں خالق ارض وسما کائنات کے ہر ذرہ میں جلوہ نما تھا بلکہ کائنات سے ہٹ کر

اُس کا کوئی وجود ہی نہ تھا اس طبقہ کا یہ تخیل یقین وایمان کی حد تک پہونچ گیا تھا کہ دنیائے محسوسات کے ہر ذرہ میں اس روح اعظم کی تجلیات پرتو فگن ہیں یا روح اعظم نے اپنی صورت کی جلوہ گری کے لئے کائنات میں ظہور کیا ہے یعنی ہر رنگ میں اسی شاہد حسن کا جلوہ، ہر پھول میں اسی کی مہک اور اسی کے رُخِ رنگین کی نمائش ہے، بلکہ فلسفیانہ تخیل نے اس راہ میں مزید کشادگی اس طبقہ کے دلوں میں پیدا کردی تھی جس نے اس تصور کو عقیدہ کی شکل دیدی کہ وحدت مطلق کے سوا سب اعتبار محض ہے اور وحدت مطلق ایک حقیقت ثابتہ ہے باقی سب مجاز یا حقیقت کا پرتو ہیں اور یہ عالم ظاہر ذات وجوب کا مظہر ہی نہیں بلکہ اشیاء عالم اس کی مجازی صورتیں ہیں اور ساتھ ہی اشیاء عالم اور ذات واجب میں سورج اور کرنوں کا تعلق ہے، ذات واجب آفتاب ہے اور شعاعیں اشیاء عالم۔ اس کثرت الوہیت میں ذات واجب کے تصور کو کثرت میں وحدت کی جلوہ گری کا نام دینا غلط نہ ہوگا۔

ذات واحد اور ہستی وجوب کے لئے تامل زبان میں "کدول" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے ایک ایسی قادر مطلق ہستی مراد لی گئی ہے جو تمام کائنات کی اصل مالک ومختار ہے اور اسی کے ساتھ انسانی فہم و ادراک سے بالاتر اور عقل وشعور کی رسائیوں سے ماوریٰ ہی نہیں بلکہ اس کے آستانۂ عالیہ تک طائر تخیل اور مرغ تصور کی پرواز بھی ناممکن ہے تامل زبان کی قدیم تصنیف "تول کاپیم" میں کدول (خدا) کی یہ حقیقت بھی بالتصریح بیان کی گئی ہے کہ وہ "نرکار" یعنی صورت تجسیم سے مبرہ اور منزہ ہے اور ساتھ ہی حاضر وناظر اور قادر علیٰ کل شئ ہے اس کی تجلیات ہر چیز میں اس طرح جلوہ نما ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں اس سے جدا نہیں کی جاسکتیں، ذات واحد کے لئے "کدول" کے علاوہ ایک لفظ کنتھائی بھی تامل زبان میں ملتا ہے جس سے وہ قوی اور توانا تر ہستی مراد لی گئی ہے جو "تنتوؤں" سے بالاتر ہے۔ تلا سوامی پلے کی متصوفانہ تشریح وتوضیح کے مطابق "تنتوا" سے وہ بے شمار لباس مراد ہیں جن سے روح انسانی اپنے ارتقا کے دوران بادقات مختلفہ ملبوس رہتی ہے تاآنکہ حیات وممات کے لامتناہی چکر سے آزاد ہوکر روح اعظم یعنی اس قوی اور توانا ہستی میں جذب ہوجاتی ہے جسے کدول یا کنتھائی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(باقی)